دعوتِ اسلامی

اور

اس کے اصول و آداب

محمد فاروق خاں

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعوت اسلامی
اور
اُس کے اصول وآداب

دعوتِ اسلامی کے اصول و آداب کیا ہیں جن کا لحاظ ایک داعی کو اپنی دعوتی سرگرمیوں میں رکھنا چاہیے؟ اس سلسلے میں جب ہم قرآن وحدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں واضح اور بیّن ہدایات ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے زندگی کے دیگر مسائل کی طرح خاص اس مسئلہ میں بھی ہماری پوری رہنمائی فرمائی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس سلسلے میں کچھ باتیں پیش کرسکوں۔ دعوت اسلامی کے اصول وآداب کے بارے میں قرآن مجید نے ایک جامع ہدایت یہ دی ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ﴿۱۲۵﴾ (النحل:۱۲۵)

''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور ان لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہتر سے بہتر ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ داعیٔ حق کا یہ فرض ہے کہ وہ دعوت کے کام میں ایک طرف حکمت کو ملحوظ رکھے تو دوسری طرف موعظۂ حسنہ سے کام لے۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ ضرورت ہو تو وہ باطل

کے ابطال اور حق کے اثبات کے لیے عقلی دلائل کو بھی استعمال کرے۔ اور یہ ثابت کردے کہ اہلِ باطل کے پاس فریب وگمان اور ظن وتخمین یا جاہلی عصبیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن یہ کام نہایت ضبط وتحمل اور بردباری کے ساتھ کرنے کا ہے۔ یہ کام بہتر سے بہتر طریق پر انجام دینے کا ہے۔ اس میں ذرا سا تساہل بھی دعوتی کوشش کو ناکام بنادینے کے لیے کافی ہے۔ باطل کی تردید میں ہمیشہ اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ مخالف فریق کے جذبات کو کم سے کم ٹھیس لگے اور اُسے یہ احساس ہوجائے کہ حق وہ نہیں ہے جس کو وہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حق کی کشش اور جاذبیت اسے اپنی طرف کھینچ لے۔ باطل کی چوں کہ کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ اس لیے باطل پرست کبھی بھی مباحثہ میں انصاف کی روش اختیار نہیں کرسکتے۔ یہ ان کی مجبوری ہے کہ وہ فریب کاری سے کام لے کر دوسروں کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کریں۔

حکمت دعوتی سرگرمی میں جس سے کام لینے کی تعلیم قرآن نے دی ہے اس کے مفہوم میں وہ علم ودانش اور فہم صحیح ہی شامل نہیں ہے جو عقل اور دل دونوں کو مطمئن کرسکے بلکہ اس کے مفہوم میں شرافت اور اعلیٰ ظرفی اور بہترین تدبیر وعمل بھی داخل ہے۔

حق کی ترجمانی میں ہم جتنا زیادہ کام یاب ہوں گے وہ اتنا ہی زیادہ لوگوں کے لیے باعث کشش ثابت ہوگا۔ حکمت کا تقاضا ہے کہ حق کو بہتر سے بہتر انداز میں پیش کیا جائے۔ اس کی ہر ترجمانی اور وضاحت اگر وہ صحیح ہوگی تو وہ لازماً انسان کے اپنے دل کی آواز ثابت ہوگی۔ یہ وہ آواز ہے جس کو سننے کے لیے انسان کی فطرت ازل سے بےقرار ہے۔ اسلام کی دعوت کی تعبیر قرآن نے مختلف الفاظ سے کی ہے جس سے ایک طرف تو دعوت کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں، دوسری طرف اس کی وجہ سے حق کی دعوت انسان کے گہرے سے گہرے احساسات و جذبات کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اور انسان محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کی فطرت اور اس کی حقیقی طلب وجستجو کا تقاضا ہے کہ وہ اس دعوت پر لبیک کہے۔ یہاں قرآن سے کچھ مثالیں پیش کی جارہی ہیں جن سے اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن اپنی دعوت کو کس طرح مختلف عنوان سے تعبیر کرتا ہے جن میں سے ہر ایک عنوان انسان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے کافی ہے۔

دعوتِ الی اللہ

قرآن اپنی دعوت کو 'دعوت الی اللہ' سے موسوم کرتا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہوا ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ (یوسف:۱۰۸)

''کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک و برتر ہے اور شرک کرنے والوں میں سے میں نہیں ہوں۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ (الرعد:۳۶)

''کہہ دو کہ مجھے تو صرف یہ حکم ملا ہے کہ اللہ کی بندگی کروں اور اس کے ساتھ شرک کا روادار نہ ہوں۔ میں اُسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ (الاحزاب:۴۵،۴۶)

''اے نبیؐ ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر، اللہ کی طرف اس کے اذن سے دعوت دینے والا بنا کر اور چراغِ روشن بنا کر۔''

ایک جگہ فرمایا:

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ (الحج:۶۷)

''تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔''

اسی طرح ایک دوسری جگہ حکم ہوا ہے:

وَ لَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَ

لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾ (القصص:۸۷)

''اور ایسا نہ ہونے پائے کہ جب اللہ کی آیات تمھاری طرف نازل ہوں تو کفار تمھیں ان سے باز رکھیں۔ تم تو اپنے رب کی طرف دعوت دو اور مشرکوں میں ہرگز شامل نہ ہو۔''

ایک جگہ فرمایا گیا:

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۳﴾ (حٰم السجدہ:۳۳)

''اور اس شخص کی بات سے اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف دعوت دی اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلم ہوں۔''

''دعوت الی اللہ'' سے بہتر دعوت کیا ہوسکتی ہے۔ دوسری ساری دعوتیں اس دعوت کے مقابلہ میں پھیکی ہی نہیں مختلف خرابیوں کا باعث بھی ہیں۔ وطنیت کی دعوت ہو یا قومیت کی، یا کسی خاص نسل ورنگ کی یا کسی خاص طبقے کی خواہ وہ طبقہ مزدوروں کا ہو یا سرمایہ داروں کا، اس طرح کی دعوت پر سارے انسانوں کو جمع نہیں کیا جاسکتا۔ محدود مقاصد کے تحت جب انسانیت مختلف قوموں اور طبقوں اور گروہوں میں بٹ جائے اور وہ اپنے محدود مقاصد کے لیے سرگرمِ عمل ہو تو اس کا انجام باہمی منافرت وکش مکش اور جنگ وخوں ریزی کی صورت میں سامنے آنا چاہیے اور آج یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں رہی ہے۔

خدا ہی ہے جس کی طلب ہر انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔ جس کی جویا ہر انسانی فطرت ہے۔ وہی ہے جس سے انسان امیدیں قائم کرسکتا ہے، وہی ہے جو اسے لازوال نعمتوں سے ہم کنار کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہی ہے جو جذبہ شوق کی پناہ گاہ، معلوم ونامعلوم امنگوں کا تنہا جواب ہے۔ وہی ہے جس سے وابستگی، دلوں کے لیے قرار اور بے چین روح کے لیے باعث سکون وراحت ہے۔ وہی ہے جو انسان کی صحیح رہنمائی فرماسکتا ہے۔ وہی ہے جو ایسا صحیح، معتدل اور فطری مبنی بر عدل طریقِ زندگی اور ضابطۂ حیات بخش سکتا ہے، جس کی پابندی کسی فرد یا گروہ کی حق تلفی پر منتج نہیں ہوسکتی۔

دعوت اسلامی حقیقت میں دعوت الی اللہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دعوت کو قبول نہ

کرنے کا بُرا انجام جب منکرِ حق کے سامنے آئے گا تو وہ پکار اٹھے گا:

يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

(الزمر:۵۶)

''افسوس میری اس تقصیر پر جو اللہ کے (حق کی ادائیگی کے) سلسلے میں مجھ سے ہوئی۔ میں تو الٹا مذاق ہی اڑاتا رہا۔''

دعوت الی الحیاۃ

یہ دعوت الی اللہ درحقیقت زندگی کی دعوت ہے۔ زندگی کی چاہت ہر شخص کے اندر پائی جاتی ہے۔ اگر شعور و ہوش کا تعلق زندگی سے ہے تو بے شعوری و بے خبری موت ہے۔ انسان جس قدر حق سے آشنا ہوگا اُسی قدر وہ حیات سے بہرہ مند ہوگا۔ پستی اور مسکنت سے اُسے نجات حاصل ہوگی۔ وہ مقام عزت پر فائز ہوگا۔ اُسے ایسی قوت حاصل ہوگی جسے شکست دینا ممکن نہیں۔ اب کون ہے جو ایسی زندگی کو پسند نہ کرے۔ کون ہے جو ایسی زندگی سے منھ پھیرے۔ لیکن جہل و نادانی کی وجہ سے آدمی پستی کو بلندی، موت کو حیات اور افلاس کو غنا سمجھنے لگتا ہے۔ قرآن دعوت دیتا ہے کہ انسان موت کی تاریکیوں سے نکل کر زندگی کی طرف بڑھے۔ پستی و مسکنت سے نکلے۔

قرآن میں صاف ارشاد ہوا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ

(الانفال:۲۴)

''اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ رسول تمھیں اس چیز کی طرف دعوت دیں جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے۔''

یہ زندگی اہلِ ایمان ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ جن کے اعمال ان کے ایمان کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ

(النحل:۹۷)

”جو بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بہ شرطے کہ ہو وہ مومن، اُسے ہم پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔“

یہ زندگی اسے حاصل ہوتی ہے جو قرآن کی دعوت کو قبول کرتا ہے۔ اس کے لیے خدا علم و بصیرت اور شریعت کی شکل میں وہ روشنی فراہم کرتا ہے جس کے ساتھ وہ انسانی سماج میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کے کسی گوشہ میں کوئی تاریکی نہیں ہوتی۔ دل کی دنیا سے لے کر زندگی کی عام دوڑ دھوپ تک کہیں بھی اس کی زندگی میں عدم مطابقت یا تضاد نہیں پایا جاتا۔ قرآن میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

اَوَ مَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَ جَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَـيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا‌ؕ (الانعام: ۱۲۲)

”کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اُسے وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا اور کسی طرح اس سے نہ نکلتا ہو۔“

دعوت الی الہدیٰ

قرآن اپنی دعوت کو دعوت الی الہدیٰ سے بھی تعبیر کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ خدا نے اپنے رسول کو ہدیٰ اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ وہ اسے تمام دین پر غالب کردے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ‌ؕ (الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اُس کو پوری جنسِ دین پر غالب کردے۔“

قرآن کی نگاہ میں سب سے بڑا ظالم ہے وہ شخص جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جائے اور وہ اس سے منھ پھیرے اور اُس برے انجام کو بھول جائے جس کا

سروسامان اس نے خود اپنے ہاتھوں کیا ہے؟ دراصل ایسے لوگوں کے دلوں پر غلاف چڑھے ہوتے ہیں جو انھیں قرآن کی بات کو نہیں سمجھنے دیتے اور ان کے کانوں میں گرانی ہوتی ہے کہ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِنۡ تَدۡعُهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى فَلَنۡ يَّهۡتَدُوۡۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾ (الکہف:۵۷)

"تم ان کو ہدایت کی طرف کتنی ہی دعوت دو وہ اس حالت میں کبھی بھی ہدایت نہ پائیں گے۔"

ہدیٰ درحقیقت وہ سامان رہنمائی ہے جس کے بغیر انسان کبھی اپنے مقصدِ حیات کو حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کی کام یابی اور فلاح اسی ہدیٰ سے وابستہ ہے۔ اس سے بے نیازی کے بعد انسان کے لیے گم راہی اور ضلالت کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ گم راہی اور ضلالت اختیار کرنے کا مطلب تباہی اور خسران کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ غلط راہ پر چل کر نہ کبھی کوئی شخص منزلِ مقصود کو پاسکا ہے اور نہ پاسکتا ہے۔

قرآن کی دعوت جس ہدیٰ کی طرف ہے اس کا تعلق انسان کی فکر کی دنیا سے بھی ہے اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے بھی۔ اس لیے زندگی کے کسی معاملے میں اس ہدی سے صرفِ نظر کرنا اپنے کو غلط راہ پر ڈالنے کے مترادف ہے۔ سیدھا اور انسان کے مناسب حال اگر کوئی راستہ ہوسکتا ہے تو وہ وہی ہے جس کی طرف خدا نے رہنمائی فرمائی ہے۔ خدا سے بڑھ کر انسان کی فطرت اور اس کی ضرورت کا علم کسے ہوسکتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر رحیم اور مہربان کون ہوگا۔ اسی لیے قرآن نے اپنی دعوت کو دعوت الی صراط مستقیم قرار دیا ہے۔

دعوت الی صراط مستقیم

چناں چہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

وَ اِنَّكَ لَتَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۷۳﴾ (المؤمنون:۷۳)

"تم تو لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہو۔"

یہ راستہ درحقیقت بندگیٔ رب کا راستہ ہے۔ بندگیٔ رب کے سوا زندگی بسر کرنے کے لیے جتنی بھی صورتیں تجویز کی جائیں گی وہ انسان کی اصل فطرت کے خلاف اور اس کے حق میں

تباہی اور ہلاکت ہی کا سامان ہوں گی۔ انسان کی موجودہ زندگی بھی اپنی معنویت کھودے گی اور آئندہ کے سارے روشن امکانات اس کے لیے ختم ہوجائیں گے۔ سیدھا راستہ بندگیٔ رب کا طریقہ ہی ہوسکتا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۵۱ (آل عمران:۵۱)

''اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہٰذا اسی کی بندگی اختیار کرو۔ یہ سیدھا راستہ ہے۔''

ایمان بہ رب العالمین کی دعوت

پھر قرآن اپنی دعوت کو ایمانِ رب کی دعوت قرار دیتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ (الحدید:۸)

''تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے جب کہ رسول تمھیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔''

عقل وفہم سے کام لینے والوں اور کھلی آنکھوں کائنات میں غور وفکر کرنے والوں کی پکار یہ ہوتی ہے:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ

(آل عمران: ۱۹۳)

''ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلا رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے۔''

ایمان ویقین کے بغیر نہ اسلام ہے اور نہ بندگیِ رب، ایمان کے بغیر خدا کی دکھائی ہوئی راہ میں ایک قدم بھی چلنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن قرآن کو جو ایمان مطلوب ہے اس کا تعلق محض انسان کے قلب ہی سے نہیں ہے بلکہ یہ ایمان ایک مومنانہ زندگی کے سانچے میں ڈھل کر نمایاں ہوتا ہے۔ مومن کی زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ بھی اس کے ایمان سے الگ اور بے گانہ نہیں ہوتا۔

دعوت الی الاسلام

اسی لیے قرآن اپنی دعوت کو دعوت الی الاسلام سے بھی تعبیر کرتا ہے اور اس کو سب سے بڑا ظلم قرار دیتا ہے کہ کسی کو اسلام کی دعوت دی جائے اور وہ جھوٹ اور بہتان اور افترا پردازیوں پر اُتر آئے۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الصف: ۷)

''اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھے حالاں کہ اسے اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو؟ ایسے ظالموں کو خدا ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

یعنی اُسے کسی اور چیز کی طرف نہیں خدا کی طرف بلایا جا رہا ہو اور اسے کسی اور کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ خدا کی بندگی کے لیے کہا جا رہا ہو جس میں سراسر اسی کا فائدہ ہے۔ لیکن پھر بھی اگر وہ اس سے منہ پھیرتا ہے تو اس کے ظالم ہونے میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

دعوت الی الخیر

قرآن نے اپنی دعوت کو دعوت الی الخیر سے تعبیر کیا ہے۔ ہر انسان اپنی بھلائی کا خواہاں ہوتا ہے۔ انسان کی اسی فطری خواہش کی بنا پر اسے جس چیز کی دعوت دی گئی ہے اسے خیر سے تعبیر کیا۔ اس لیے کہ انسان کی بھلائی کا سارا انحصار اسی بات پر ہے کہ خدا کی دعوت پر لبیک کہے اور اس طریقِ زندگی کو اختیار کرے جس کی طرف قرآن رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن اہلِ ایمان کا یہ فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دیں۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ (آل عمران: ۱۰۴)

''تمہارے پیکر میں ایک ایسی امت ظاہر ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے۔''

موجودہ دنیا انسان کی تمناؤں اور خواہشات سے کم تر ہے۔ اس کی فطری تمنا تو یہ ہے کہ اُسے ابدی حیات حاصل ہو جس میں ہر طرح کی نعمتیں اُسے میسر ہوں۔ جس میں اُسے وہ سب

کچھ مل سکے جس کی اُس کے دل میں آرزو پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہمیشہ کی صحت اور جوانی اور پریشانیوں اور ہر طرح کے اندیشوں اور آفتوں سے نجات۔ انسان کو یہ خواہشات دی ہی اس لیے گئی ہے کہ کسی مرحلے میں ان کو پورا ہونا ہے۔ جنت ہی وہ جگہ ہے جسے انسانوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کی دنیا کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ جنت ان ہی لوگوں کے حصے میں آسکے گی جو اس کی طرف بڑھیں گے۔ رب کائنات کی اطاعت اور بندگی ہی جنت کی طرف پیش قدمی ہے۔

دعوت الی الجنۃ

اس لیے قرآن کی دعوت حقیقت میں دعوت الی الجنۃ ہے۔ چناں چہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

وَ اللّٰهُ يَدْعُوٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ (البقرہ:۲۲۱)

''اللہ اپنے اذن سے جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور وہ اپنے احکام واضح انداز میں لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے شاید وہ سبق حاصل کریں۔''

دعوت الی دارِ السلام

جنت ہی حقیقی امن وسلامتی کا گہوارہ ہے۔ وہی اصل دار السلام ہے۔ جہاں کوئی فتنہ و فساد راہ نہیں پاسکتا۔ یہ سلامتی کا گھر ان لوگوں کو ملے گا جو نصیحت قبول کرتے ہیں اور حق سے روگردانی اختیار نہیں کرتے۔ ان کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

(الانعام:۱۲۷)

''ان کے رب کے پاس ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کا سرپرست ہے ان اعمال کی وجہ سے جو وہ اختیار کرتے ہیں۔''

قرآن میں آیا بھی ہے: وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ (یونس:۲۵) ''اور اللہ بلاتا ہے دار السلام (سلامتی کے گھر) کی طرف۔''

دعوت الی النّجاۃ

قرآن کی دعوت عذاب الٰہی سے نجات کی دعوت ہے، جیسا کہ قرآن ایک مردِ مومن کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:

وَ يٰقَوْمِ مَالِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ (المؤمن: ۴۱)

''اے میری قوم، آخر یہ کیا بات ہے کہ میں تو تم لوگوں کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دے رہے ہو! تم مجھے اس کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کی روش اختیار کروں۔ اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھیراؤں جن کا کوئی میرے پاس علم نہیں ہے حالاں کہ میں تمھیں زبردست اور مغفرت فرمانے والے خدا کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔''

معلوم ہوا کہ خدا کی طرف رجوع ہونا ہی نجات کا ذریعہ ہے۔ اسے چھوڑ کر کسی اور کا دامن گرفتہ ہونا اور اصل خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے جس کا انجام جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا۔

دعوتِ اسلامی کی یہ مختلف تعبیریں درحقیقت حکمتِ دعوت کے تحت اختیار کی گئی ہیں۔ تاکہ ایک طرف اس سے لوگوں پر اس دعوت کے مختلف پہلو واضح ہوسکیں اور دوسری طرف ان کے لیے یہ دعوت قابلِ توجہ اور جاذبِ قلب و نگاہ ہوسکے۔ ان تعبیروں میں ترغیب اور ترہیب میں سے کسی نہ کسی پہلو کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے یا پھر انسان کی اصل فطرت کو دعوت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، حکمت کا تقاضا یہی تھا۔ دعوت کو اگر اس کی صحیح شکل میں پیش کیا جائے تو اسلام کی دعوت بذاتِ خود اپنے اندر ایسی معنویت، اور معقولیت اور کشش رکھتی ہے کہ اس کا انکار وہی شخص کرسکتا ہے جو یا تو بالکل اندھا ہو یا پھر اس نے کسی جاہلی عصبیت کی وجہ سے انکار ہی کی قسم کھا رکھی ہو۔ پھولوں کا اپنا حسن اور ان کی دل کشی ہی اس کے لیے کافی ہوتی ہے کہ نگاہیں اس کی طرف متوجہ ہوں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حق کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی خوبی اور دل کشی لوگوں پر عیاں ہو سکے۔ اپنی کم فہمی یا کم علمی کی وجہ سے بسا اوقات حق کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ظاہری اور باطنی خوبیوں سے عاری محض ایک سخت گیر قانون کی شکل میں سامنے آتا ہے اور انسان کے ذہنی و قلبی نشاط کا اس میں کوئی سامان نہیں ہوتا۔ اس میں قصور حق کا نہیں بلکہ اس کے پیش کرنے والے غیر تربیت یافتہ داعیوں اور مبلغوں کا ہے۔ وہ اسے پیش کرتے وقت پورے اطمینان اور انشراح کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ:

Take the Manna of today, it is not a code of life but life also.

انھیں دین حق میں قانون اور ضابطۂ حیات تو دکھائی دیتا ہے لیکن خود حیات نظر نہیں آتی۔ جب کہ قرآن اسے عین حیات سے تعبیر کرتا ہے۔

یاد دہانی

قرآن میں ایک طرف دین کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ انسان پر اوپر سے تھوپی ہوئی کوئی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد خود انسان کے اندر موجود نہ ہو۔ خدا کا اقرار اور اس کی بندگی کا جذبہ خود انسان کی فطرت ہے۔ خدا کی کتاب قرآن کی حیثیت تو یاد دہانی کی ہے جسے سن کر انسان کو اپنا بھولا ہوا سبق یاد آ جائے۔

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾ (الاعراف: ٦٣)

”کیا تمھیں اس پر تعجب ہے کہ تمھارے پاس خود تمھارے اپنے میں سے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمھارے رب کی یاد دہانی کرائی گئی تاکہ تمھیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ سکو اور شاید تم پر رحم کیا جائے؟“

دین اور تقویٰ تو انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ بہ راہ راست اس کے اندر اس کا القا کیا گیا ہے۔ وحی و رسالت کے ذریعہ سے جو پیغام اُسے پہنچتا ہے وہ تو اُس الہام کی توضیح و تصدیق کے لیے ہے جس سے وہ پیدائشی طور پر نوازا گیا ہے۔ چناں چہ قرآن میں ہے:

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۝ (الشمس: ۷، ۸)

''شاہد ہے نفس انسانی اور جیسا کہ اُسے ہم وار کیا۔ پھر اس کی بدی اور اس کا تقویٰ اس پر الہام کیا۔''

یعنی بدی کیا ہے اور پرہیز گاری اور تقویٰ کیا ہے؟ اس کا علم و شعور اس کی فطرت کو براہِ راست عطا ہوا ہے۔ وہ علم و شعور جس کی حیثیت الہام کی ہو یا جسے الہام کے لفظ سے موسوم کیا جائے سب سے زیادہ یقینی اور لائق اعتبار ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں شبہ کرنا دراصل خود اپنے بارے میں شبہ میں مبتلا ہونا ہے جو ممکن نہیں۔ کسی شخص کو خدا کا پیغام پہنچانے کا مطلب اصل میں اس شخص کو اس پیغام کی یاددہانی کرانی ہے جو اس تک پہلے ہی پہنچا ہوا ہے۔ لیکن وہ اس سے غافل ہے۔ رسول ذکر یعنی یاددہانی بن کر لوگوں کے سامنے آتا ہے۔ وہ کوئی ایسا علم لے کر نہیں آتا جس سے انسان کی فطرت یکسر بے گانہ ہو۔ چناں چہ قرآن میں ہے:

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ (الطلاق: ۱۰، ۱۱)

''اللہ نے تمھاری طرف ایک ذکر اُتار دیا ہے، یعنی رسول جو تمھیں اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے۔''

ایمان کی بنیاد جذبۂ شکر

پھر اسی حکمتِ دعوت کے پیشِ نظر قرآن خدا کے اُن بے پایاں احسانات کا تذکرہ کرتا ہے جو خدا نے بنی نوع انسان پر کیے ہیں اور پھر وہ انسان کے اندر پائے جانے والے جذبۂ شکر کو اُبھارتا ہے۔ انسان ایک اخلاقی وجود رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے محسن آقا کا شکر گزار ہو، ناشکرا بن کر نہ رہے۔ انسان کے لیے رزق کا سامان خدا نے کیا ہے۔ انسان صرف رزق استعمال کر کے نہ رہ جائے بلکہ وہ خدا کا شکر بھی ادا کرے۔ اُسے پیٹ ہی نہیں دل بھی بخشا گیا ہے۔ فرمایا گیا:

كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ (سبا:۱۵)

''کھاؤ اپنے رب کا رزق اور بجالاؤ اس کا شکر۔''

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

(البقرہ:۱۷۲)

''تمھیں جو پاک چیزیں ہم نے عطا کی ہیں انھیں کھاؤ اور اللہ کے شکر گزار رہو اگر تم اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔''

یہی جذبۂ شکر ہے جس پر ایمان کی بنا رکھی گئی ہے۔ کیوں کہ ایسا ایمان ہی معتبر اور جمود نا آشنا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی ایمان زندگی کی حرارت بن سکتا ہے۔ جس ایمان کی بنیاد محسوس حقیقت پر ہو اور حقیقت بھی وہ جس کی حیثیت انسان کے لیے رزق کی ہو جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا، وہ ایمان ایک خشک تصور بن کر نہیں رہ سکتا۔ بے شک ایمان کی بنیاد شکر پر رکھی گئی ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾ (النساء:۱۴۷)

''اللہ کو آخر کیا پڑی ہے کہ تمھیں سزا دے اگر تم شکر گزار ہو اور ایمان لاؤ، اللہ بڑا قدرداں اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

شکر گزار بندہ ہی اس کا مستحق ہے کہ اُسے مزید عطا کیا جائے۔ دنیا میں اگر اس نے شکر گزار بن کر زندگی بسر کی تو اس کے لیے آخرت کی نعمت ہائے فراواں بھی مہیا ہیں:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴿۷﴾ (ابراہیم:۷)

''اگر تم شکر گزار بنو گے تو میں تمھیں مزید نوازوں گا لیکن اگر تم کفران نعمت کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔''

قیامت میں اصل سوال یہ ہوگا کہ نعمتیں پا کر کسی نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ بے حس بنا رہا یا خدا کا شکر گزار بندہ بن کر رہا۔ خدا کی طاعت میں اس نے اپنے کو دیا یا اُلٹے وہ اس کا باغی و نافرمان ثابت ہوا۔

لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ۝ (التکاثر:۸)

''تم سے ضرور اس دن ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی ہوگی۔''

یہ حکمت دعوت و تبلیغ ہی کا اقتضا تھا کہ ان لوگوں کو جو حق کو قبول کرتے ہیں زندہ اور قبولِ حق سے انکار کرنے والوں کو مردہ کہا گیا۔ حق کے حاملین کو ذی علم اور حق سے ناآشنا لوگوں کو علم سے بے بہرہ ٹھہرایا گیا۔ ایک گروہ اندھا اور دوسرے کو آنکھوں والا۔ ایک کو پوری روشنی میں زندگی بسر کرنے والا اور دوسرے کو تاریکیوں میں بھٹکنے والا قرار دیا گیا تاکہ انسان سمجھ سے کام لے۔ وہ موت کے مقابلے میں زندگی کو، جہل کے مقابلے میں علم کو، اندھے پن کے مقابلے میں بینائی اور بصارت کو اور تاریکیوں کے مقابلے میں روشنی کو ترجیح دے۔ قرآن اس تسلیم شدہ حقیقت کا ذکر صاف الفاظ میں کرتا ہے۔

وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَ الْبَصِیْرُ ۝ وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ ۝ وَ لَا الظِّلُّ
وَ لَا الْحَرُوْرُ ۝ وَ مَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ (فاطر:۱۹-۲۲)

''اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں، نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں، نہ چھاؤں اور گرمی ہی۔ اور نہ زندہ اور مردے مساوی ہوتے ہیں۔''

زندگی کی تلاش

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن کے اندر کچھ زندگی ہوتی ہے وہی زندگی کے پیغام کو سن سکتے ہیں۔ لیکن جو مردہ ہوں یا جو کان کے بہرے بن گئے ہوں انھیں کوئی بات بھی نہیں سنائی جا سکتی۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ (النمل:۸۰)

''تم مردوں کو تو نہیں سنا سکتے، نہ ان بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو جو پیٹھ پھیرے بھاگے جا رہے ہوں۔''

یہی حقیقت قرآن میں ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۝ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ
الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ۝ (یٰس:۶۹، ۷۰)

''یہ تو ایک نصیحت اور قرآن مبین ہے تا کہ وہ ہر اس شخص کو خبر دار کر دے جو زندہ ہو اور منکرین پر حجت قائم ہو۔''

زندگی کے پیام کے لیے زندگیوں کی تلاش ہونی چاہیے۔ مردہ لوگوں میں روح پھونکنے کی کوشش تو کی جاسکتی ہے لیکن زیادہ وقت ان میں صرف کرنے کے بہ جائے دوسروں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

دعوتِ بندگیِ رب کی دل آویزی

یہ حکمت ہی کا تقاضا تھا کہ بندگیِ رب کی دل آویزی اور حسن کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا تا کہ جن کے اندر کچھ ذوق ہو، جن کی روح گروہی عصبیتوں اور مفاد پرستی کے سبب مردہ نہ ہوگئی ہو وہ اس دعوت پر لبیک کہہ سکیں۔ اور دنیا کی کوئی چیز انھیں ان کے ارادے سے باز نہ رکھ سکے۔ فرمایا گیا:

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ (البقرہ:۱۳۸)

''خدا کے رنگ میں ڈوب جاؤ، اس کے رنگ سے زیادہ اچھا رنگ کس کا ہوگا؟ ہم تو اُسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔ (یعنی اُسی کے رنگ کو ہم نے اختیار کیا ہے)''

حکمت کے ساتھ دعوت کا فریضہ دورِ اوّل میں احسن طریق پر قرآن کے ذریعہ سے انجام پایا۔ ایک بڑی اکثریت ہے جو قرآن سے متاثر ہو کر ایمان لے آئی۔ قرآن کے مؤثر ہونے میں اس کے صوتی جمال کا ہی نہیں اس کے پاکیزہ پیغام اور اس کے فطری طرزِ استدلال کو بھی بڑا دخل ہے۔

دعوت اسلامی کے پیش کرنے میں بنیادی اصول و آداب کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر یہاں اس سلسلہ کی چند باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

آسانی پیدا کرنا

دین کو مشکل اور نا قابلِ عبور وادی بنا کر پیش کرنے کے بہ جائے اُسے آسان سے

آسان اور قابل عمل چیز کی شکل میں پیش کرنا ایک داعی کی ذمہ داری ہے۔ قرآن میں خود فرمایا گیا ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ:۱۸۵)

''اللہ تمھارے ساتھ نرمی اور آسانی چاہتا ہے، تمھارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا۔''

ایک دوسری جگہ یہ اصولی بات بیان کی ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ:۲۸۶)

''اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔''

اہل ایمان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ۔ (بخاری)

''تم تو آسانی بہم پہنچانے کے لیے بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَسَكِّنُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔ (بخاری، مسلم)

''آسانی پیدا کرو، دشواری میں نہ ڈالو، تسکین دو، متنفر نہ کرو۔''

ابوداوٗد کی روایت ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا بَعَثَ اَحَدًا مِّنْ اَصْحَابِهٖ فِيْ بَعْضِ اَمْرِهٖ قَالَ: بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اصحاب میں سے کسی کام پر کسی کو بھیجتے تو فرماتے: خوش کرنا، بشارت دینا، نفرت نہ دلانا، آسانی پیدا کرنا، دشواری اور مشکل میں نہ ڈالنا۔''

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَلِّمُوْا وَيَسِّرُوْا وَعَلِّمُوْا وَيَسِّرُوْا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ (ادب المفرد)

''دین سکھاؤ اور آسانی پیدا کرو، دین سکھاؤ اور آسانی پیدا کرو۔ یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی۔''

ایک روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما کو یمن کی طرف بھیجتے ہوئے فرمایا:

یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَتَطَا وَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا

''تم دونوں آسانی پیدا کرنا، سختی سے کام نہ لینا، خوشی کی بات کرنا اور لوگوں کو متنفر نہ کرنا، باہم متحد رہنا، اختلاف کے جھگڑے لے کر نہ بیٹھ جانا۔''

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی خدمت انجام دینے والوں کا فرض ہے کہ وہ اُداسی اور نفرت پھیلانے کے بہ جائے لوگوں کو خوشی کا باعث ثابت ہوں۔ سختی کے بہ جائے ان کی اصل پالیسی نرمی کی ہو۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے اللہ نے فرمایا تھا:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾ (طٰہٰ: ۴۳، ۴۴)

''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہوگیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے۔''

مربوط گفتگو

عام حالات میں مخاطب کی رعایت رکھتے ہوئے دین کی بنیادی باتیں ایک خاص ترتیب سے پیش کی جائیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ساری باتیں ایک ہی وقت میں پیش کی جائیں۔ چناں چہ بخاری و مسلم کی روایت ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مَعَاذًا اِلَى الْيَمَنِ فَقَالَ اِنَّكَ تَاْتِىْ قَوْمًا اَهْلَ كِتَابٍ فَادْعُهُمْ اِلٰى شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذَالِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدِافْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلٰوٰتٍ فِى الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذَالِكَ

فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدِافْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذَالِكَ فَاِيَّاكَ وَكَرَائِمَ اَمْوَالِهِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهٗ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ۔ (بخاری و مسلم)

''حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن کی طرف بھیجتے ہوئے فرمایا کہ تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی طرف جا رہے ہو تو پہلے ان کو اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اگر وہ اس کو مان لیں تو انھیں بتانا کہ اللہ نے ان پر رات اور دن میں پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے۔ اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو انھیں بتانا کہ اللہ نے ان کے مال داروں پر زکوٰۃ فرض کی ہے کہ وہ ان کے مال داروں سے وصول کر کے ان ہی کے غریبوں میں تقسیم کی جائے گی۔ اگر وہ اسے بھی مان لیں تو خبردار ان کے اچھے مالوں کے لینے سے بچنا اور ہمیشہ مظلوم کی فریاد سے بچنے کی کوشش کرنا کیوں کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔''

اس روایت سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دین کو لوگوں کے لیے کس طرح آسان اور قابلِ قبول شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ صدقہ نکالنا عام حالات میں نفس کے لیے مشکل ہوتا ہے، اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ فرمائی صدقہ ادا کرنے کا حکم اللہ کی طرف سے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صدقہ ہر ایک کو ادا نہیں کرنا ہے، بلکہ صدقہ مال داروں پر فرض کیا گیا ہے۔ غریبوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ صدقہ دے کر کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس کا مال اس سے چھین لیا گیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جو صدقہ اس کے مال داروں سے لیا جائے گا وہ اُس کے ہی غریبوں کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

اس طرح صدقہ دینے والے کے جذبۂ ترحم اور جذبۂ اخوت کو ابھار کر صدقہ دینے کو ظلم و زیادتی نہیں بلکہ ایک اخلاقی عمل قرار دے کر اس کے لیے آسان کر دیا گیا ہے۔ پھر صدقہ دینے پر جس اجر و ثواب کا وعدہ ہے اُسے بھی پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ عمل اور زیادہ آسان ہو جاتا

ہے۔ پھر تاکید کی گئی کہ صدقہ لینے میں اس کا خیال رکھا جائے کہ اچھا مال چھانٹ کر نہ لے لیا جائے کہ صدقہ دینے والے کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔

مخاطب کے علم وفہم کی رعایت

دعوتی کام میں مخاطب کے فہم یا علمی سطح کی رعایت ضروری ہے۔ اس کا اندازہ حضرت جابر بن سلیمؓ کی روایت سے ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر پوچھا:

اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ: اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ الَّذِیْ اِذَا اَصَابَکَ ضُرٌّ فَدَعَوْتَهٗ کَشَفَهٗ عَنْکَ وَاِنْ اَصَابَکَ عَامٌ سَنَةٌ فَدَعَوْتَهٗ اَنْبَتَهَا لَکَ وَاِذَا کُنْتَ بِاَرْضٍ قَفْرٍ اَوْفَلَاةٍ فَضَلَّتْ رَاحِلَتُکَ فَدَعَوْتَهٗ رَدَّهَا عَلَیْکَ قَالَ: قُلْتُ اَعْهَدْ اِلَیَّ۔ قَالَ: لَا تَسُبَّنَّ اَحَدًا۔ قَالَ فَمَا سَبَبْتُ بَعْدَهٗ حُرًّا وَلَاعَبْدًا وَلَا بَعِیْرًا وَلَا شَاةً۔ قَالَ: وَلَا تَحْقَرَنَّ شَیْئًا مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَاَنْ تَکَلَّمَ اَخَاکَ وَاَنْتَ مُنْبَسِطٌ اِلَیْهِ وَجْهَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنَ الْمَعْرُوْفِ۔

''کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا: میں اس خدا کا رسول ہوں کہ جب تمھیں کوئی نقصان پہنچے پھر اس سے دعا کرو تو وہ اس نقصان کو رفع کرے اور جس سال تم پر قحط آئے پھر تم اس سے دعا کرو تو وہ غلّہ اور سبزہ اُگائے اور جب تم کسی خاص بے آب و گیاہ سرزمین میں ہو پھر تمھاری اونٹنی گم ہو جائے اور تم اس سے دعا کرو تو وہ تمھاری اونٹنی واپس لائے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ تو آپؐ نے فرمایا: کسی کو گالی مت دینا، جابرؓ کا بیان ہے کہ اس دن سے میں نے کسی کو گالی نہ دی نہ آزاد کو، نہ غلام کو، نہ اونٹ کو، نہ بکری کو۔ پھر آپؐ نے فرمایا: جو کوئی تجھے کوئی چیز بھیجے تو اسے حقیر مت سمجھ اور اپنے بھائی سے کشادہ پیشانی کے ساتھ گفتگو کرو

کیوں کہ یہ معروف میں داخل ہے۔''

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

وَاِیَّاکَ وَاِسْبَالِ الْاِزَارِ فَاِنَّھَا مِنَ الْمَخِیْلَةِ وَاِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ الْمَخِیْلَةَ وَاِنْ مَّرءٌ شَتَمَکَ وَعَیَّرَکَ بِمَا یَعْلَمُ فِیْکَ فَلَا تُعَیِّرَہُ بِمَا تَعْلَمُ فِیْہِ فَاِنَّمَا وَبَالُ ذٰلِکَ عَلَیْہِ۔ (ابوداؤد)

''بچو ازار کے لٹکانے سے کیوں کہ یہ کبر و غرور کی بات ہے۔ اور اللہ کو کبر و غرور پسند نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص تمھیں گالی دے اور تمھارے عیب کو جو وہ جانتا ہے بیان کرے تو اس کے عیب کو جو تمھیں معلوم ہو بیان نہ کرو کیوں کہ اس کے کہے کا وبال اسی پر ہے۔''

اس روایت سے معلوم ہوا کہ مخاطب شخص کے فہم اور اس کی سمجھ اور دل چسپی کا لحاظ رکھتے ہوئے گفتگو کرنی چاہیے۔ ایک عام عرب کے ذہن اور اس کے ماحول کے پس منظر میں حضورؐ بتاتے ہیں کہ وہ کس خدا کے رسول ہیں۔ وہی خدا جس سے مصیبت میں دعائیں مانگی جاتی ہیں اور جو رحم فرما کر بندے کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی پریشانی دور فرماتا ہے۔ ایسے مہربان خدا کے رسولؐ کے پیغام کو سننا کتنا ضروری ہوتا ہے۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ کو جو نصیحتیں کی ہیں ان کا انسان کی روز کی عملی زندگی سے تعلق ہے۔ اس سے اس بات کا علم ہوتا ہے۔ سچی نصیحت اور تعلیم وہی ہے جو عمل کے پیکر میں نمایاں ہو سکے۔ جو محض خیالی اور فکری چیز بن کر نہ رہے۔

احساسِ غیرت کو اُبھارنا

غیرت اور اپنی آن کا احساس ایک فطری چیز ہے اس کو دین میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّ لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ۔

(ابن ماجہ، البیہقی فی شعب الایمان)

''ہر دین کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اسلام کا مزاج حیا ہے۔''

بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے:

وَمِنْ اَجَلِ غَيْرَةِ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنهَا وَمَا بَطَنَ۔

''یہ اللہ کی غیرت ہے کہ اس نے کھلے اور چھپے تمام بے حیائی کے کاموں کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

یعنی فواحش سے اللہ نے اگر روکا ہے تو اس کے پیچھے اس کی غیرت وحمیت کام کر رہی ہے۔ دین کا سوال جب آدمی کے لیے اس کی غیرت وحمیت کا سوال بن جائے تو جاننا چاہیے کہ دین کے مزاج سے اس کا مزاج ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ اب نہ دینی مقاصد سے وہ دور رہ سکتا ہے اور نہ دین اس کی شخصیت سے الگ جداگانہ کوئی چیز ہے۔

دین کے حق میں آدمی کی غیرت کو بیدار کرنا داعی کا فریضہ ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر غیرت وحمیت کا جو مادہ پایا جاتا ہے داعی اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمیں اس کی مثال خود حضورؐ کی سیرت میں ملتی ہے۔

طائف سے واپس آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ ابوجہل وہاں موجود تھا۔ دوسرے اور لوگ بھی موجود تھے۔ ابوجہل نے فقرہ چست کرتے ہوئے کہا: ال مناف! یہ ہے تمہارا نبی! عُتبہ بن ربیعہ جو ہاشمی خاندان سے تھا اور قریش ہی کے مشرکانہ دین پر قائم تھا۔ لیکن اس سے یہ برداشت نہ ہوا کہ کوئی اس کے خاندان پر چوٹیں کرے۔ وہ بول پڑا، ''اگر ہم میں کوئی نبی ہوجائے یا کسی کو بادشاہت حاصل ہوجائے تو اس میں جلنے کی کیا بات ہے؟''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی زبان سے یہ سنا تو اس کے قریب آئے اور فرمایا:

''تعجب ہے عتبہ! خدا اور رسول کے لیے تو تجھے غیرت نہ آئی۔ لیکن اپنے لیے آ گئی!!''

یعنی تمھاری غیرت وحمیت کا دائرہ کتنا محدود اور تنگ ہے۔ کاش تم جان سکتے کہ خدا اور اس کے رسول خاندان اور قبیلہ سے کہیں زیادہ آدمی سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔

نفسیات کا لحاظ

دعوتی کام میں مخاطب شخص یا قوم کی رعایت ضروری ہے۔ اس کا اندازہ قرآن کی اس مشہور آیت سے کیا جاسکتا ہے:

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِکَ بِهٖ شَیۡـًٔا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ (آل عمران: ۶۴)

''کہو، اے اہلِ کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ نہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی کریں اور نہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔''

اس آیت میں پہلی چیز تو یہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کو ان کی بے راہ روی اور ضلالت اور مشرکانہ معتقدات کے پیش نظر اے گم راہو، اے شرک میں مبتلا لوگو کہہ کر نہیں خطاب کیا گیا بلکہ انھیں ایسے لقب سے خطاب فرمایا گیا جس سے ان کی شان و امتیاز کا اظہار ہوتا تھا۔ جو ان کے لیے باعثِ عزت و افتخار تھا۔ پھر فرمایا گیا کہ ہماری توحید کی دعوت ایسی نہیں ہے جس سے تمھارے کان ناآشنا ہوں۔ یہ دعوت تو وہی ہے جس کے داعی حقیقت میں تم خود بھی ہو، یہ الگ بات ہے آج تم اسے فراموش کر بیٹھے ہو۔ یہ بات کہ تم اسے فراموش کر بیٹھے ہو، حذف فرمادیا۔ اس لیے کہ مقصد جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں، انھیں ان کے مقام بلند سے آگاہ کرنا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوتی خطوط اہل کتاب کو لکھے ہیں ان میں اس آیت کو نقل فرمایا ہے۔ کسریٰ پرویز جو مجوسی تھا اس کے نام یا دیگر مشرک سرداروں کے نام جو آپؐ کے مکتوبات پائے جاتے ہیں ان میں اس آیت کو نقل نہیں فرمایا گیا ہے۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ مشرکین اور مجوسی بادشاہ ہوں کے مذہب کی بنیاد شرک پر قائم تھی اس لیے ان کے لیے یہی کافی تھا کہ انھیں اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور قبول دعوت کی صورت میں انھیں دین و دنیا کی سلامتی کا مژدہ سنایا جائے۔ چناں چہ آپؐ نے یہی کیا۔

اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اہل کتاب حکم رانوں کے نام جو مکتوبات آپؐ نے بھیجے ہیں ان میں اَسۡلِمۡ تَسۡلَمۡ کے بعد یُؤۡتِکَ اللّٰهُ اَجۡرَکَ مَرَّتَیۡنِ (اللہ تمھیں دوہرے اجر سے نوازے گا) بھی ہے۔ یعنی اہل کتاب کو یہ خوش خبری دی گئی ہے کہ اگر تم دعوت حق کو قبول کرتے ہو تو اللہ کے یہاں تمھارے لیے دوہرا اجر ہے۔ درحقیقت یہ فقرہ یُؤۡتِکَ اللّٰهُ اَجۡرَکَ

مَرَّتَيۡنِ، قرآن مجید کی اس آیت سے مستنبط ہے:

اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِهٖ هُمۡ بِهٖ يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾ وَ اِذَا يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنۡ قَبۡلِهٖ مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ (القصص: ۵۲-۵۴)

”جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب یہ انھیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ یہ حقیقت میں حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم (اطاعت گزار) ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کا دوہرا اجر ملے گا۔“

یہ دوہرا اجر اس لیے ملے گا کہ انھوں نے پچھلی کتاب کو ماننے کے بعد قرآن پر بھی ایمان لانے کی سعادت حاصل کی۔ اور اس سلسلے میں کسی تعصب سے کام نہ لیا۔ انھوں نے ہر حال میں خدا کی اطاعت اور فرماں برداری ہی کو اپنے پیش نظر رکھا۔

انسان کا کوئی نیک عمل ہو، عمل کی نوعیت کے لحاظ سے اس پر اجر مترتّب ہوتا ہے۔ چناں چہ حدیث میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخص ہیں جن کو دوہرا اجر ملے گا۔ وہ اہل کتاب جو دو بار ایمان لایا (ایک بار اپنے نبی پر اور دوسری بار آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر)، وہ غلام جس نے آقا اور خدا دونوں کا حق ادا کیا۔ وہ شخص جس نے اپنی باندی کو تعلیم دی، ادب سکھایا اور پھر آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا۔ (بخاری)

مخاطب کی نفسیات کی رعایت قرآن کی اس آیت میں دیکھی جا سکتی ہے۔

وَ قَالُوۡا كُوۡنُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى تَهۡتَدُوۡا ؕ قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ حَنِيۡفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۳۵﴾ (البقرہ: ۱۳۵)

”یہودی کہتے ہیں کہ یہودی ہو تو راہِ راست پاؤ گے عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی ہو، تو ہدایت یاب ہو گے۔ کہو: نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ۔ اور ابراہیم مشرکوں سے نہ تھا۔“

یہودیوں اور عیسائیوں کے قول کے جواب میں مجرد توحید کے طریقہ کا ذکر نہیں کیا

بلکہ توحید کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ منسوب کرتے ہوئے پیش کیا۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ سے یہود اور نصاریٰ دونوں ہی اپنا تعلق ظاہر کرتے تھے اور انھیں اپنا مقتدا سمجھتے تھے۔ اس آیت میں انھیں یاد دلایا گیا کہ تمھیں اپنے بزرگ ابراہیمؑ کا کچھ بھی خیال نہیں جن کی محبت کا دم بھرتے ہوئے تم تھکتے نہیں۔ تمھارے اعمال و افکار میں شرک شامل و داخل ہو گیا ہے حالاں کہ حضرت ابراہیمؑ توحید خالص کے علم بردار رہے ہیں۔ یہ ساری باتیں چند جچے تلے الفاظ میں جامع انداز میں کہہ دی گئی ہیں۔ ہر بات واضح طور پر الفاظ میں بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ الفاظ میں بیان کیے بغیر یہ باتیں خود بہ خود ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس سے بات کا اثر بھی بڑھ جاتا ہے اور مخاطب کے جذبات کی بھی بیش از بیش رعایت ہو جاتی ہے۔

کلمۂ سواء کی تلاش

اگر حق کی کہیں اور سے بھی تصدیق و تائید ہو خاص طور سے مخاطب قوم کی مذہبی کتابوں یا اس کی روایات سے تو داعیِ حق کے لیے یہ خوشی کی بات ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ اس طرح مخاطب قوم کو اس کے حق کے سلسلے میں اس کی اپنی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانا نسبتاً آسان ہوگا۔ اس کی مثال ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں بھی ملتی ہیں۔ چناں چہ بخاری میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ جَاءَ حِبْرٌ مِنَ الْاَحْبَارِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ اِنَّا نَجِدُ اَنَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ السَّمٰوٰتِ عَلٰی اِصْبَعٍ وَالْاَرْضِيْنَ عَلٰی اِصْبَعٍ وَالشَّجَرَ عَلٰی اِصْبَعٍ وَالْمَآءِ وَالثَّرٰی عَلٰی اِصْبَعٍ وَسَآئِرَ الْخَلَائِقِ عَلٰی اِصْبَعٍ فَيَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ فَضَحِكَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی بَدَتْ نَوَاجِذُهٗ تَصْدِيْقًا لِقَوْلِ الْحِبْرِ ثُمَّ قَرَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (بخاری)

''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تورات کے عالموں میں سے ایک عالم آیا۔ اس نے کہا کہ ہم تورات میں پاتے ہیں کہ اللہ آسمانوں کو ایک انگلی پر اٹھالے گا، زمین کو ایک انگلی پر، درختوں کو ایک انگلی پر، پانی اور مٹی کو ایک انگلی پر اور تمام مخلوقات کو ایک انگلی پر اٹھالے گا اور فرمائے گا کہ میں ہوں بادشاہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے یہاں تک کہ آپ کے دانت ظاہر ہو گئے، گویا آپؐ نے اس یہودی عالم کی تصدیق فرمائی۔ پھر آپ نے (تائید میں) یہ آیت تلاوت کی: اور لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ قیامت کے دن پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دستِ راست میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ پاک، برتر ہے وہ اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

اہلِ کتاب کی وہ باتیں جن کی تصدیق یا تردید قرآن سے نہیں ہوتی ان کے بارے میں محتاط رویہ یہی ہوسکتا ہے کہ توقف اختیار کیا جائے۔ اس لیے کہ اگر ہم ان کی تردید کرتے ہیں تو کیا خبر ممکن ہے وہ سچ ہوں اور اگر ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں تو اس کا بھی امکان ہے کہ وہ باتیں حق نہ ہوں۔ مومن کو ہر معاملہ میں عدل وانصاف ملحوظ رکھنا ہے۔ بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

قَالَ كَانَ اَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَءُ وْنَ التَّوْرٰةِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ وَيُفَسِّرُوْنَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَقُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ۔ (بخاری)

''حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب عبرانی زبان میں تورات پڑھتے اور اہلِ اسلام کے لیے اس کی تفسیر عربی میں کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نہ اہلِ کتاب کی تصدیق کرو اور نہ انھیں جھٹلاؤ بلکہ تم یہ کہو کہ ہم اللہ پر اور جو کچھ اس کی جانب سے نازل ہوا ہے اس پر ایمان لائے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ تم جو کچھ بیان کر رہے ہو اگر وہ واقعی خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں

تو ہمارا ان پر ایمان ہے۔ تمھارا اتنا کہنا کافی ہے۔ نہ تو ان کی پیش کی ہوئی باتوں کو جھٹلانے کی ضرورت ہے اور نہ ان کی تصدیق کرنے کی۔ آپؐ نے مسلمانوں کو ایسے موقعے پر جو بات کہنے کی تعلیم فرمائی اس میں تہذیب کی رعایت کے ساتھ اہلِ کتاب کے جذبات کی سبھی رعایت ملحوظ ہے۔ آپؐ نے مسلمانوں کو یہ نہیں سکھایا کہ تم یہ کہو کہ اے اہلِ کتاب ہم سے تم جو کچھ بیان کرتے ہو وہ اگر خدا کا نازل کیا ہوا ہے تو ہم اس کو مانتے ہیں اور اگر وہ تمھاری اپنی گھڑی ہوئی باتیں ہیں تو ہم ان کو نہیں مانتے۔ ایسے موقعے پر جو بات کہنے کی آپؐ نے تعلیم دی اُس کا مطلب یہی ہے لیکن انداز مہذب ہے۔ اس سے مخاطب قوم کے جذبات کو ٹھیس بھی نہیں لگتی۔

داعی کے جذبات

داعی کے جذبات کا اندازہ لگانا ہو تو قرآن کی اُن آیات کی تلاوت کیجیے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بے چینی کا ذکر کیا گیا ہے جو لوگوں کو راہِ حق کی طرف لانے کے سلسلے میں آپ کے دل میں پائی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر قرآن میں ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞ (الشعراء:۳)

''اے نبیؐ، شاید تم اس غم میں اپنی جان ہی کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔''

آپؐ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا مَثَلِىْ وَمَثَلُ اُمَّتِىْ كَمَثَلِ رُجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَا رًا فَجَعَلَتِ الدَّوَّابُ وَالْفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيْهِ وَاَنَا اٰخِذٌ بِحُجَرِ كُمْ وَاَنْتُمْ تَقَحَّمُوْنَ فِيْهِ۔ (مسلم)

''میری اور میری امت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی نے آگ جلائی تو اس میں کیڑے مکوڑے اور پتنگے گرنے لگے تو میں پکڑے ہوں تمھاری کمروں کو اور تم ہو کہ اس میں ٹوٹے پڑتے ہو۔''

جب تک داعیِ حق کے دل میں مخلوقِ خدا کو بُرے انجام سے بچانے کے لیے یہ بے چینی اور اضطراب نہ ہو، صحیح معنی میں وہ دعوت کے فریضہ کو ادا نہیں کرسکتا۔ داعی کو انتہا درجہ کا

غم گسار ہونا چاہیے۔ یہ غم گساری قوم کی عین چارہ سازی ہے۔

پھر جو لوگ دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہیں اور حق کے راستے میں اس کے ساتھی بنتے ہیں ان کے لیے اس کے دل میں جو جگہ ہوتی ہے اُسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کا اندازہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے کیجیے جو آپؐ نے مدینہ کے انصار کے لیے فرمائے تھے۔ آپؐ نے فرمایا تھا:

اِنِّی عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ ھَاجَرْتُ اِلَی اللّٰہِ وَاِلَیْکُمْ اَلْمَحْیَا مَحْیَاکُمْ وَالْمَمَاتُ مَمَاتُکُمْ۔ (مسلم)

”میں خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں نے خدا کی طرف اور تمھاری طرف ہجرت اختیار کی ہے۔ میری زندگی تمھاری زندگی ہے اور میری موت تمھاری موت ہے۔“

یعنی مجھے تمھارے ہی ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ میں تمھیں کسی حال میں چھوڑ نہیں سکتا۔

کسی نے ایسے ہی گہرے تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے کہا تھا:

Behold, I do not give lectures, or little charity but when I give, I give myself.

نقد عطیہ

دین کا سچا داعی جب پیغام حق لے کر کھڑا ہوتا ہے تو جہاں وہ لوگوں کی اصل منزل کی نشان دہی کرتا ہے، جہاں وہ کسی عظیم کام یابی و کامرانی کی خوش خبری دیتا ہے وہیں اُس کے پاس ان لوگوں کو دینے کے لیے جو اس کے پیغام کو قبول کرتے ہیں کچھ نقد شے بھی ہوتی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے لذّتِ یقین اور حلاوت ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ سکینت اور اطمینان قلب کی دولت ہے جو غیر مومن قلب کو کبھی بھی میسر نہیں آتی۔ یہ لوگوں کی ایک ایسی ضرورت ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

قدرت اگر شہد کی مکھی اور بھونروں سے پھولوں میں تخم ریزی کا کام لیتی ہے تو ان کے لیے رنگ و بو بھی فراہم کرتی ہے۔ حسن و دل کشی بھی اور شہد کی مٹھاس بھی۔ دین کی طرف آنے

والوں کے لیے بھی بہت کچھ نقد سامانِ تواضع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

اور وہ سامان فراہم بھی ہو سکتا ہے، بہ شرطے کہ اس کی ضرورت کا احساس ہو۔

جذبات کی رعایت

انسان ہمیشہ جذبات کی رہنمائی قبول کرتا ہے اسی سلسلے میں ایک چیز یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ آدمی کی زندگی ہمیشہ جذبات کی رہنمائی میں بسر ہوتی ہے۔ آدمی قدم قدم پر جو فیصلے کرتا ہے اس میں اصل فیصلہ کن چیز اس کا قلبی جھکاؤ اور جذبات ہوا کرتے ہیں۔ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں فکر کو جذبات کے ساتھ ہم آہنگ رکھا گیا ہے۔

فکر جب تک جذبہ کی صورت اختیار نہ کرے اُس پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ایک داعی ذہن (Intellect) سے زیادہ آدمی کے جذبات (Emotions) سے اپیل کرتا ہے۔ بالعموم لوگوں کے ذہن کی کھڑکیوں پر پہرے لگے ہوتے ہیں لیکن دل کے دروازے پر کوئی پہرہ نہیں ہوتا۔ دل کے دروازے سے حق کی آواز کسی بھی شخص تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ بشرطے کہ دل کے دروازے تک پہنچنے کا ہنر آدمی کو آتا ہو۔ جذبات مجروح ہوں یہ کسی قیمت پر آدمی کو گوارا نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک سے کہا گیا ہے کہ اے نبی تم اگر کہیں درشت خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد وپیش سے چھٹ جاتے۔ لیکن یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نہایت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ (ال عمران:۱۵۹)

''پس یہ اللہ کی رحمت ہے جو تم ان کے لیے نرم ہو۔ اگر تم کہیں ترش مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔''

یعنی تمھاری بلند اور پاکیزہ تعلیمات کے باوجود لوگ تمھارے پاس ٹھہر نہ سکتے۔ معلوم ہوا کہ جب تک آدمی کے جذبات کی رعایت نہ ہو وہ دیر تک کسی چیز پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص کا بیان ہے کہ اس نے ۱۵، ۱۶ سال تک لوگوں کے ذہن سے اپیل کیا لیکن کوئی

Response نہ مل سکا پھر اس نے لوگوں کے Emotion سے اپیل کی تو کچھ ہی سال کے اندر ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ لوگ اس کے پیرو بن گئے۔

دین میں انسان کی نفسیات اور اس کے جذبات کی پوری رعایت پائی جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس راز سے بہ خوبی واقف تھے۔ ثقیف کے لوگ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مغیرہ بن شعبہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ (اہل ثقیف) میری قوم کے لوگ ہیں کیا میں انھیں اپنے پاس اُتارلوں اور ان کی تواضع کروں؟ آپؐ نے فرمایا:

لا امنعک ان تکرم قومک

''میں تمھیں اپنی قوم کی عزت کرنے سے منع نہیں کرتا لیکن انھیں ایسی جگہ اتارو جہاں قرآن کی آواز ان کے کانوں میں پڑ سکے۔''

داعی کا کردار

دعوت کے کاموں پر داعی کے کردار کا نمایاں اثر پڑتا ہے۔ اس لیے داعی کو اعلیٰ کردار کا حامل ہونا چاہیے۔ کیوں کہ وہ عقل ہی کو نہیں جذبات انسانی کو بھی اپیل کرتا ہے۔

مدینہ کے متصل ایک بار ایک قافلہ آ کر ٹھہرا۔ قافلے کے لوگوں کا ارادہ تھا کہ سفر کے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے بدل کر شہر میں داخل ہوں۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے ان سے ایک سرخ اونٹ کچھ کھجوروں کے بدلے میں خریدا اور اونٹ کی مہار سنبھال کر شہر کو چلا گیا۔ جب وہ چلا گیا تو لوگ کہنے لگے کہ یہ ہم نے کیا کیا۔ اونٹ ہم نے ایسے شخص کو دے دیا جسے ہم جانتے بھی نہیں اور قیمت وصول کرنے کا کوئی انتظام ہی نہ کیا۔ قافلہ کے ساتھ ایک ہودج نشین عورت تھی، وہ بولی میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا ہے کہ وہ چودھویں رات کے چاند کے روشن حصہ جیسا تھا۔ وہ فریب کار نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا آدمی قیمت نہ دے تو میں ادا کردوں گی۔ اتنے میں ایک شخص نے آ کر کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شتر کی قیمت دے کر بھیجا ہے اور ضیافت کے لیے الگ سے کھجوریں بھیجی ہیں۔ کھاؤ اور قیمت کی کھجوریں ناپ کر لے لو۔ قافلے کے لوگ شہر میں داخل ہوئے تو آپؐ کو منبر پر تقریر کرتے ہوئے پایا۔

وقت کے مسائل اور دعوتِ اسلامی

کوئی بھی معاشرہ یا سماج ہو، لوگوں کو معاشرتی، معاشی اور سیاسی مختلف قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ یہ صحیح نہ ہوگا کہ ان مسائل سے بالکل صرف نظر کرلیا جائے لیکن ان مسائل کے پیچھے اصل دعوتی کام اور اس کے تقاضوں کو فراموش کرنا کسی بھی حالت میں روا نہیں ہوسکتا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو عرب میں کتنے ہی مسائل موجود تھے۔ لیکن آپؐ نے جس اساسی مسئلہ کو لے کر اپنی دعوت کا آغاز فرمایا وہ عقیدہ کا مسئلہ تھا۔ یعنی اللہ کی ربوبیت، انسان کی عبودیت اور ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت کا مسئلہ۔ اسی بنیادی مسئلہ کے حل ہی سے انسان کے دوسرے سارے ہی مسائل حل ہوتے ہیں۔ یہ بنیادی مسئلہ اگر حل نہ ہو تو دوسرے مسائل پر قابو پانا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

زندگی میں مسائل ہمیشہ ایک دوسرے کی حق تلفی سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان ظلم و زیادتی سے باز آئے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحیح فکر کا حامل ہو اور وہ مبنی بر انصاف ضابطۂ حیات کا پابند ہو۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ اسی لیے آغاز کار میں نبیؐ نے لوگوں کو ایمان کی دعوت دی۔

آپؐ چاہتے تو عرب قومیت کا نعرہ لگا کر اپنے کام کا آغاز کرسکتے تھے۔ اس لیے کہ اس وقت عربوں کے شاداب اور زرخیز علاقے عربوں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے قبضے میں تھے۔ شمال میں شام کے علاقے روم کے زیرنگیں تھے۔ عرب حکام رومیوں کے تحت حکومت چلا رہے تھے۔ اسی طرح جنوب میں یمن کے علاقہ پر اہلِ فارس کا قبضہ تھا، جن کے

ماتحت عرب کے حاکم اس کا انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔ عربوں کے پاس صرف حجاز، تہامہ اور نجد کے علاقے تھے یا پھر وہ بے آب و گیاہ صحرا جن میں کہیں کہیں نخلستان پائے جاتے تھے۔

اگر آپؐ قوم پرستی کا نعرہ لگاتے تو عربوں کے لیے اس میں کشش تھی اور آپؐ کے اندر قیادت کی جو صلاحیت تھی اس سے کام لے کر آپ اپنی طاقت بڑھا سکتے تھے۔

اسی طرح آپ اقتصادی انقلاب کی بات کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ عرب معاشرہ دولت کی تقسیم میں عدل اور انصاف کے نظام سے بے گانہ تھا۔ تھوڑے سے لوگ تھے جن کے قبضہ میں تجارت تھی اور جن کے پاس سرمایہ تھا، ملک کی غالب اکثریت مفلوک الحال تھی۔ اہل ثروت ہی عزت اور شرافت کے اجارہ دار تھے۔ ایسی حالت میں طبقاتی کش مکش کے ذریعہ سے تحریک چلائی جا سکتی تھی۔ جس کے نتیجہ میں غالب اکثریت کی حمایت آپ کو حاصل ہوتی۔

اسی طرح جزیرۃ العرب میں جو اخلاقی بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اس سے کون واقف نہیں ہے۔ بے حیائی اور بے شرمی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ایسی حالت میں آپؐ ایک اصلاحی تحریک لے کر آگے بڑھ سکتے تھے۔

لیکن آپ نے کام کا آغاز خدا کی رہنمائی میں جس طرح فرمایا صحیح معنی میں کام کرنے کا وہی صحیح ترین اور اعلیٰ ترین طریقہ ہو سکتا ہے۔ ایمان اور صحیح عقیدہ کے بغیر کسی صالح نظام کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ضرورت ہمہ گیر انقلاب کی تھی وہ عقیدہ کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اصل زور عقیدے کی درستی اور اصلاح پر دی گئی۔ اسی طرح وہ جماعت وجود میں لائی جا سکتی تھی جو ایک صالح نظام کو بہ حسن و خوبی کام یابی کے ساتھ چلانے کی اہل ہو سکتی تھی۔

فساد فی الارض، اخلاقی بگاڑ اور ظلم و زیادتی کو صحیح معنی میں دور کیا نہیں جا سکتا تھا جب تک کہ لوگوں کے اذہان اور ان کے قلوب کو ایمان کے سانچے میں نہ ڈھال دیا جائے۔ اور ایک ایسا گروہ وجود میں نہ لایا جائے جو حق کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا عزم و حوصلہ رکھتا ہو۔ اور جو جاہلی نظام کو خواہ وہ کسی رنگ میں ہو نظام حق میں بدل دینے کی طاقت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ اس لیے نبیؐ نے اصل زور اس پر دیا کہ زمین پر شہداء اللہ کا ایک طاقت ور گروہ وجود میں آئے جو اپنے تصورات، جذبات و عزائم کے لحاظ سے اس حق کا علم بردار ہو جس کی فطرت میں غلبہ و

استیلاء کی شان پائی جاتی ہے۔

لیکن بنیادی عقائد کی طرف دعوت دینے اور اس کے لیے سرگرم ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ حقائق اور ان مسائل سے بالکل صرف نظر کرلیا جائے جن سے عام لوگوں کو سابقہ پیش آرہا ہو۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے توحید اور تصحیح عقائد کی طرف دعوت دینے کے ساتھ فرعون سے یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ اس نے بنی اسرائیل کو جس عذاب میں مبتلا کرر کھا ہے وہ اس سے باز آجائے اور بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے دے کہ وہ ان کی تعلیم و تربیت کرسکیں۔ تاکہ ان کے لیے ایک بہترین مستقبل کا امکان پیدا ہوسکے۔ قرآن میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا:

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰی ﴿۴۶﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ﴿۴۷﴾ (طٰہٰ:۴۶-۴۷)

"فرمایا ڈرو نہیں، میں تمھارے ساتھ ہوں، سنتا اور دیکھتا ہوں۔ پس جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے رسول ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انھیں مبتلائے عذاب نہ رکھ، ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں۔ سلامتی ہے اس کے لیے جو ہدایت کی پیروی کرے۔"

حضرت نوحؑ کا جو تذکرہ قرآن میں ملتا ہے اُسے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کو جہاں شرک سے روکا اور اسے خالص توحید کی طرف دعوت دی وہیں انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ توحید کی دعوت آخرت کے نقطۂ نگاہ ہی سے نہیں دنیوی پہلو سے بھی تمھارے لیے سراپا خیر ہے۔ چناں چہ قرآن نے ان کا قول نقل کیا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ (نوح:۱۰-۱۳)

"اور میں نے کہا کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو یقیناً وہ بڑا ہی مغفرت فرمانے

والا ہے۔ وہ آسمان کو تم پر خوب برستا چھوڑے گا اور مال اور بیٹوں سے تمھیں فروغ عطا کرے گا اور تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری فرمائے گا۔ تمھیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کے لیے کسی وقار و عظمت کی توقع نہیں رکھتے۔''

اسی طرح لوطؑ کی دعوتی سرگرمیوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی قوم کو اس گھناؤنی برائی سے باز آنے کی تلقین کی جس میں ان کی قوم مبتلا تھی۔ قرآن میں ہے:

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ (الاعراف:۸۰-۸۱)

''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو۔ اس کا ارتکاب دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے خواہش پوری کرتے ہو بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔''

حضرت شعیبؑ نے بھی صحیح عقائد کی طرف اپنی قوم کو بلانے کے ساتھ ساتھ قوم کے لوگوں میں جو بگاڑ آ گیا تھا اسے نظر انداز نہیں کیا بلکہ صاف الفاظ میں قوم سے مطالبہ کیا کہ وہ اس خرابی کو اپنے اندر سے دور کرے۔ قرآن میں ہے:

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ (الاعراف:۸۵،۸۶)

''اور اہل مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، تمھارے پاس تمھارے

رب کی طرف سے ایک دلیل روشن آ چکی ہے۔ پس تم ناپ اور تول پوری کرو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو۔ اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد بگاڑ پیدا نہ کرو۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ اور ہر راہ پر اس لیے نہ بیٹھو کہ دھمکیاں دو اور اس شخص کو اللہ کے راستے سے روکنے لگو جو اس پر ایمان لائے اور اس راہ کے ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ کہ جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تم کو بہت کر دیا اور دیکھو فساد برپا کرنے والوں کا کیسا انجام ہوا۔"

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ حضورؐ نے مجرد حق کی دعوت ہی نہیں پیش کی بلکہ قرآن میں لوگوں کے اخلاق و اعمال کو زیر بحث لا کر مومنانہ اور غیر مومنانہ زندگیوں کا موازنہ کیا گیا۔ اور دکھایا گیا ہے کہ ایمان کی دعوت کو قبول کرنے والوں کی زندگیاں کتنی پاکیزہ ہوتی ہیں اور وہ کسی معاشرہ کے لیے کس درجہ رحمت ثابت ہوئے ہیں۔ اور اس کے برخلاف جو لوگ دنیا ہی کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور انبیاء کی دعوت پر کان نہیں دھرتے وہ کس درجہ بندگانِ خدا کے حقوق کو پامال کرتے ہیں اور اہلِ زمین کے لیے عذاب ثابت ہوتے ہیں۔

دعوت بالحکمہ کے پیشِ نظر اگر انسانی مسائل کو زیر بحث لا کر دکھایا جائے کہ کس طرح ان مسائل کو اسلام بہ حسن و خوبی حل کر سکتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سردارانِ قریش کی صلح کی خواہش پر اپنے چچا ابوطالب سے فرمایا تھا کہ چچا جان، میں ان کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں کہ اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابع فرمان اور عجم ان کا باج گزار ہو جائے۔ پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا کہ وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔

عملی لحاظ سے اسلام کے علاوہ سارے ہی نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ اس کا اعتراف خود یورپ کے کتنے ہی مفکرین کر چکے ہیں۔ Emery Reves نے اپنی کتاب The Anatomy of Peace میں لکھا ہے:

"نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی سماج میں ایک بگاڑ پید کر رکھا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ ہو جائے اس کا حل دریافت کرنے میں

کام یاب ہو سکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالم گیریت (Universalism) میں ہے۔''

پروفیسر ٹوین بی (Arnold J. Toynbee) اپنی کتاب The World And West میں لکھتا ہے:

''مسلمانوں کا اخوت باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے نظریہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی نظریہ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔''

آگے چل کر یہی مؤرخ لکھتا ہے:

''یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا خیرہ کر دیا ہے کہ وہ اس کے تصوّرِ حیات کو آنکھیں بند کیے اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم کو کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ اپنے عالم گیر مودت واخوت کے تصور کو ترک کر کے یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصور اپنے یہاں رائج نہ کریں گے۔ ایک عالم گیر برادری کا تصور یوں تو انسانی فلاح کے لیے ہمیشہ ضروری رہا ہے۔ لیکن اس ایٹمی دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ (ص: ۳۰، ۳۱)